جلد01شمارہ17، 2024

Article

Feature Writing of Ahmad Bashir

احمد بشیر کی فیچر نگاری

Dr. Muhammad Riaz Ahmad Riaz[1], Dr. Farah Abid, [2] Dr. Nadia Anjum[3]

[1] Urdu Department, Govt. College University, Faisalabad.

[2] Department of Urdu, Govt. Islamia Graduate College for Women, Faisalabad.

[3] Department of Urdu, Govt. Assosiate College for Women, Ayub Research, Faisalabad.

ڈاکٹر محمد ریاض احمد ریاض[1]، ڈاکٹر فرح عابد[2]، ڈاکٹر نادیہ انجم[3]

[1]شعبہ اُردو (وزٹنگ لیکچرار)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، [1]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گرایجویٹ کالج برائے خواتین فیصل آباد، [2]

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین ایوب ریسرچ، فیصل آباد[3]

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:04-04-2024
Accepted:15-06-2024
Online:27-06-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an access-open article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: "Ahmad Bashir was a renowned journalist and a literary icon of Urdu. He wrote essays / articles and columns equally in English and Urdu. He chose journalism for making his livelihood, and learnt journalism from Charagh Hassan Hassrat in the daily "Amroz". He was called the founder of Urdu feature-writing. He wrote his debut feature on Gaamma Pehalwaan. After the daily "Amroz", he started writing for the weekly "Qandeel". He exhibited his writing power, along with editorial writing, in both English and Urdu journals and newspapers like: "Chataan", "Lail-o-Nahaar", "Nawa-e-Waqt", "Jang", "Musawaat", "Friday Times", "The Muslim", "The Star", "The News" and "Frontier Post". His last writing, featuring the journalistic; political; analytical and ideological characteristics, continued to publish in the monthly "Naya Zamaana" from Lahore. His style held truthfulness and candidness. He had to write uder different false names due to the atrocities of the government. He adopted the names of Bhulley Shah, Shah Anyat and Ahmad Khan Kharal for this purpose. He never let the journalistic and literary values fall a prey to worldly strategies and impurities. He was a staunch socialist and flag-bearer of social justice.

Keywords: Ahmad Bashir, Feature, Film Making, Writings, Urdu, Journalism, Literarture.

Featureفیچر انگریزی زبان کا لفظ ہے اور یہ پرانی فرانسیسی زبان سے انگریزی میں آیا۔ فرانسیسی میں یہ لفظ عمیق یا کسی کی چیز ساخت یعنی بناوٹ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں Facere،Facturaاور Factum کے الفاظ بھی یہی مفہوم ادا کرتے ہیں۔اس کے معنی نمایاں نقوش کے ہیں۔افسانوی انداز اس کی خاص ادا ہوتی ہے اور یہ ایسا مضمون ہوتا ہے جس میں غیر دلچسپ موضوع کو تحقیق اور تحریر کی امیزش سے دلچسپ بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔اس لیے اسے ادب و صحافت کا حسین امتزاج قرار دیا جاتا ہے۔اس بدولت حکومت اور معاشرے کو بہ یک وقت آئینہ دکھایا جاتا ہے۔ کسی بھی مسئلے کو وضاحت اور منطقی شواہد کے شاتھ پیش کیا جاتا ہے۔اس میں تصاویر کہانی سناتی ہیں شائستگی اور شگفتگی کا عنصر اس کی دلچسپی اہم جزو ہوتا ہے اور اس قاری کو موضوع سے متعلق تمام اہم امور خاصی حد تک آگاہی ملتی ہے اور اس حقیقت کی گرہ کشائی ہوتی ہے کہ کسی واقعہ کو تجزیے کی کسوٹی پر پرکھنے کے عمل سے وجود میں آنے والی تحریر کو فیچر کہا جاتا ہے۔ یہ تبصرے، کالم، عام اخباری رنگ، انداز اور اسلوب سے جداگانہ حیثیت کی چیز ہے۔اس میں کہانی کی دلکشی، افسانے کی لذت، سادگی، روانی، جدت، ادبیت اور انشائیت کا حسن ہوتا ہے جو اسے دیگر صحافتی اصناف سے ممیز اور منفرد کرتا ہے۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی شفیق جالندھری کی کتاب ''فیچر نگاری'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''فیچر ایک خاص صحافتی طرز تحریر ہے جو اپنے نفسِ مضمون، انداز بیان اور مقصدیت کے لحاظ سے افتتاحیہ، مضمون، مقالہ اور کالم سے یکسر مختلف ہے۔''(۱)

فیچر نگاری کو دنیا بھر کی صحافت میں انتہائی اہم حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ اب کسی اچھے اخبار کی اشاعت فیچر کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں حقائق کو دلچسپی کا ڈرامائی اور افسانوی انداز کا تڑکا لگانے کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی، بولتی تصاویر نمایاں سرخیوں کے ذریعے خاصے کی چیز بنایا جاتا ہے۔فیچر نگاری کو صحافت مین بھرپور کیتھارسس کرنے کا علم قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں لفظ تصویروں کو اور تصویریں الفاظ کو قوتِ گویائی عطا کرتی ہیں۔ واقعات کی ترتیب اور پیشکش میں دلچسپی کا عنصر نمایاں رکھا جاتا ہے جو قاری کو اصل صورتحال کے ادراک کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اُردو ادب اور صحافت میں احمد بشیر کی اہمیت مسلمہ ہے اور انہوں نے ادبی دنیا میں خاکہ نگاری اور ناول نگاری میں نمایاں مقام حاصل کیا اُردو اور انگریزی صحافت میں مضمون نگاری، کالم نگاری، اداریہ نگاری اور فیچر نگاری میں بھی نام کمایا۔

قیام پاکستان کے بعد بمبئی سے فلمی رسالہ نکالنے کا منصوبہ ٹھپ ہو گیا اور احمد بشیر کپڑا انسپکٹر کی نوکری چھوڑ کر ممتاز مفتی کے ساتھ بے روزگاری کے دن گزار رہا تھا اور اسی طرح ایک دن بیروزگاری کے عروج میں ممتاز مفتی نے اسے کہا کہ تم صحافی بن جاؤ ایک نیا اخبار نکل رہا ہے وہاں نوکری کے لیے جاؤ۔

احمد بشیر نے ایسا ہی کیا اور مولانا چراغ حسن حسرت کے پاس پہنچ گئے جاتے ہی نوکری کی درخواست کی جو رد ہو گئی اور اُٹھنے سے پہلے چائے آگئی اور پھر چائے کی پیالی سے شروع ہونے والا انٹرویو نما ہنگامہ آہستہ آہستہ آپ سے تم والے سانچے میں ڈھلا اور نوبت چائے کے پیمانے کی حدود سے تجاوز کر کے صبا کے پیمانوں تک جا پہنچی اور انگور کی بیٹی کی ہلچل سے جو تھرک پیدا ہوئی وہ انہیں راگ رنگ کے جہاں اس بازار میں لے گئی وہاں راگوں کے اتار چڑھاؤ اور سروں کے آپس میں جڑاؤ اور گانے والیوں کے بھاؤ تاؤ پر گپ شپ میں رات بھیگ گئی اور واپس جاتے ہوئے مولانا چراغ حسن حسرت بولے دفتر صبح دس بجے لگتا ہے میں دیر سے آنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ تنخواہ 210 روپے ہو گی۔

اس طرح احمد بشیر صحافی بن گئے اور مولانا چراغ حسن حسرت سے تربیت حاصل کرتے ہوئے فیچر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔

اُردو فیچر نگاری کے نمونے تو قیام پاکستان سے قبل مختلف اخبارات میں مختلف اشکال میں ملتے ہیں اور کبھی یہ فیچر کسی کالم کا حصہ ہوتا اور کسی تجزیے یا تبصرے کی صورت اختیار کیے ہوئے ہوتا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ''امروز'' نے جدید صحافتی سلسلے کو مزید جدت سے ہم کنار کیا اور احمد بشیر نے ''امروز'' میں مختلف موضوعات پر فیچر نگاری کا آغاز کیا۔ اس طرح بہت سے لوگ احمد بشیر کو پاکستان میں اردو فیچر نگاری کا بانی قرار دیتے ہیں۔ وکی انسائیکلو پیڈیا پر احمد بشیر کے نام سے سرچ کریں تو تعارفی صفحے پر درج ذیل عبارت درج ہے:

"After the independence of Pakistan in 1947, Ahmad Bashir worked for several newspapers in Pakistan. However, he is known for his days at Daily Imrose with particular foundness. He worked as a sub-

editor at Imroze where he introduced feature writing for the first time in Urdu Press."[(2)]

مفہوم: قیام پاکستان کے بعد احمد بشیر نے مختلف اخبارات میں کام کیا مگر اس کی (صحافیانہ) پہچان روزنامہ ''امروز'' سے ہوئی وہ بحیثیت سب ایڈیٹر ''امروز'' میں کام کرتا اور وہیں اس نے اُردو اخبارات میں پہلی بار فیچر نگاری کا آغاز کیا۔

احمد بشیر کے بقول مولانا ان کی تحریروں سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ مگر اشاعت کے لیے بھیج دیتے تھے انہی دنوں انہوں نے مولانا حسرت موہانی سے گپ شپ کی اور اسے انٹرویو کی شکل میں مولانا کو دکھایا تو وہ خوش ہو گئے اور انہیں فیچر نگاری پر لگا دیا۔ احمد بشیر نے اپنا پہلا فیچر رستم زماں گاما پہلوان پر لکھا یعنی شخصی فیچر سے اپنی فیچر نگاری کا آغاز کیا۔ اس حوالے سے وہ فیملی میگزین میں شائع ہونیوالے انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

> ''میں نے پہلا فیچر گاماں پہلوان پر لکھا اور اس کے بارے میں مجھے سب سے پہلے منٹو نے کہا کہ تم گاماں پہلوان پر فیچر لکھو پھر انہوں نے میرے استاد چراغ حسن حسرت سے بھی کہا کہ احمد بشیر سے کہو کہ گامے پر فیچر لکھے۔ انہوں نے کہا اور میں نے گاماں پہلوان پر پہلا فیچر لکھا۔''[(۳)]

قیام پاکستان کے بعد یہ احمد بشیر کی صحافتی زندگی اور فیچر نگاری کے حوالے سے ابتدائی دور تھا۔ احمد بشیر کی فیچر نگاری کا دوسرا دور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں احمد بشیر کے فیچر شائع ہوئے جو سیاسی اور سماجی و موضوعات پر تھے۔ اس کی مجلس ادارت میں بھی ان کا نام فیض احمد فیض کے ساتھ طبع ہوتا تھا۔ اس جریدے کی فیچر نگاری کے ضمن میں محمد اسلم ڈوگر لکھتے ہیں:

> ''فیچر نگاری کے حوالے سے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے زیراہتمام لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ'' لیل و نہار'' کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس جریدے نے فیچر نگاری میں نئے تجربات کیے تصاویر اور خاکوں کے ذریعے فیچر کے تاثرات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی یہ فیچر لے آؤٹ کے اعتبار سے بھی مثالی ہوتے تھے۔''[(۴)]

اس دور میں احمد بشیر کا سفر نامہ امریکہ بھی ''لیل ونہار'' میں قسط وار چھپا کرتا تھا جو بڑا معروف ہوا اور اس میں بھی فیچر کی سی لذت موجود تھی۔ امریکہ سے واپسی پر فلم بنانے کے جنون نے احمد بشیر کو سب کچھ بھلا دیا تھا اور فلم کے فلاپ ہونے پر احمد بشیر مٹی کا مادھو بن کر خود کو بھول گیا اور یہ جمود احمد بشیر کے فیچر نگاری کے تیسرے دور کے آغاز سے ٹوٹا جب انہوں نے پھر سے روز نامہ ''امروز'' میں ''شہر سرائے'' کے عنوان سے کالم نگاری شروع کی اور ان کالموں میں بیشتر تصویروں سے سجے ہوتے اور فیچر کی جلوہ گری دکھاتے۔ یہ کالم دراصل منی فیچر تھے اور موضوعات کا تنوع اور دلکش اسلوب جو کالم سے زیادہ فیچر نگاری کا حامل تھا اور ان میں کچھ فیچر کچھ اس طرح تھے کہ ان کی سرخیاں اور تصویریں ان فیچرز کے حسن کو نکھارتیں اور پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھتی رہتی۔ نمونے درج ذیل ہیں۔

> ''ہم سے ایک صاحب نے اپنا کری ایٹو آرٹ فورم کا ذکر کیا کہا گلبرگ میں ایک مجلس شفیتگان سے جو ڈرامائی لہار میں تجربے کرتی ہے آیئے کبھی اس کو دیکھئے مجلس عام میں کسی قسمت والے کو داخلے کی اجازت دیتی ہے۔ لوگوں کو ایک خاص قسم کا تعصب ہے باتیں بناتے ہیں شور مچاتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے ہاں شمع جلا رکھی ہے اور اس کی مدہم روشنی میں فنکار حضرات دیے کی طرح اپنی اپنی صلیبیں کندھے پر رکھے مقتل کی طرف جاتے ہیں یوں تو ہر فن کار کا یہی حال ہے جس کو کچھ کہنا ہے اس نے کندھے پر پھانسی اُٹھا رکھی ہے اور دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔''(۵)

رقص اور موسیقی اس جہان کی رنگینی ورعنائی کی علامت ہیں اور اس کے ساتھ ہر طرح کے انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تخلیق جمال کا پیرہن پہنے عورت کے رقص سے متعلق سرخیوں اور تصویر سے مزین اور تحریر کی جمالیاتی اور ثقافتی لذتوں سے معمور فیچر کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''فطرت میں حسن ہی حسن تھا۔ ہوا اور بارش فطرت کے دستِ انقلاب تھے۔ زندگی میں پھول کھلتے تھے۔ زمین ایک باغ تھی۔ سادگی، بے ریائی اور موسیقی اس کے کھلے خزانے تھے۔ ایسے میں عورت عورت تھی یعنی تخلیق جمال کا پیرہن پہنے رقص فرما تھی پھر اس کو کچھ ہو گیا پھر انسان نے مشینیں ایجاد کیں اور

زندگی ان کے سپرد کردی پھر انسان انسان نہ رہا مشین بن گیا۔آخری عورت جو
زندگی کی علامت تھی میکانکی عمل کی مکڑی نے اپنے جال میں گرفتار کر لی باقی کچھ
بھی نہ رہا۔ایک شمع تھی وہ بجھ گئی۔''(۶)

ٹی وی پر منشی امانت کی اندر سبھا کی پیشکش کے حوالے سے لکھنؤ کی عوامی اور درباری زندگی کی تصویری جھلکیاں ''اندر سبھا'' میں تو کچھ کچھ یہی ہیں مگر اس فیچر ہیں تو انیس و دبیر کی مجالس سے لے کر گانے بجانے کے جلسوں تک کی کہانی کو جمالیاتی لذتوں اور تاریخی حوالوں اور تصویری خاکوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری، استحکام اور ترقی کا احوال، اس کے ساتھ ولایتی کمپنیاں دیسی لوگوں کو انگریزی ناٹک دکھانے ہندوستان آنے لگتی ہیں اور شیکسپیئر کے ڈرامے دکھانے لگتی ہیں۔لکھنؤ کے دربار کی کھوکھلی شان، ہتھیاروں کے کند ہونے اور تلواروں کا نیاموں میں مستقل قیام، وزیروں، مشیروں، اور سرکاری گماشتوں کے وارے نیارے تھے۔اسی زوال میں فنون لطیفہ کو عروج ملا احمد بشیر لکھتے ہیں:

'' آخری تاجدار واجد علی شاہ نظام سلطنت میں جتنے کمزور اور نااندیش تھے۔فنون
لطیفہ کی اقلیم میں اتنے ہی طاقت ور اور روشن مزاج تھے۔انیس و دبیر کی مجالس
مرثیہ خوانی کے ساتھ ساتھ گانے بجانے کے جلسے بھی ان کے یادگار زمانہ ہیں وہ خود
کتھک کے بہت ماہر راگ، داری کے دلدادہ اور ناٹک کے پرستار تھے۔ان کے
بندوں نے انگریز بادشاہوں کا لباس اختیار کر لیا تھا مگر انگریزوں کے علوم اور نظام
حکومت پر کسی کی نظر نہ تھی۔انہی دنوں کہیں انگریزی اوپیرا دیکھا گیا امانت سے
فرمائش ہوئی کہ وہ بھی ایک اوپیرا اردو میں لکھیں انہوں نے اندر سبھا جسے بہت
پسند کیا گیا اور اس کی پروڈکشن بادشاہ نے خود سنبھال لی۔اندر سبھا کے بعد اور اوپیرا
بھی لکھے گئے مگر کسی نے ایسی قبولیت نہیں پائی۔'' (۷)

واجد علی شاہ اور سلطنت اور دونوں کا ذکر آتے ہی دل اس زمانے کے کلچر کی سمت متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ بات ذہن میں ابھرتی ہے کہ واجد علی شاہ شاہی کے ساتھ ساتھ فنکاری میں بھی لاثانی تھے بلکہ اس کی فنکاری شاہی پر غالب دکھائی دیتی ہے۔فیچر اندر سبھا اور واجد علی شاہ کی فنکارانہ عظمت اور ان کے دور میں فنون لطیفہ کی ترقی کا احوال دیکھیں۔احمد بشیر لکھتے ہیں:

''واجد علی شاہ غلطی سے بادشاہ بن گئے تھے۔ تقدیر نے ان کے ساتھ مذاق کیا ورنہ وہ محض آرٹسٹ تھے۔آرٹسٹوں کی تمام کمزوریاں ان میں تھیں۔۔۔ مگر واجد علی شاہ کی کہی ہوئی ٹھمریاں اور ان کے باندھے ہوئے ناچ کے بول اور باتیں ان کی یاد رہیں گی۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ٹھمری میں اختر پیا تخلص کرتے تھے۔۔۔۔ روشن چوکی ان کے ہاں کی آرکسٹرا کی شاید مکمل شکل ہے۔ پانچ سو سازندوں کی سنگت ہوتی تھی اور لطف یہ ہے کہ ان میں بیشتر ساز ہندوستانی تھے۔'' (۸)

ممتاز مفتی کو آدم جی ادبی اوارڈ نہ ملنے پر بھی احمد بشیر نے فیچر لکھا۔ اس فیچر میں انہوں نے ممتاز مفتی کو آدم جی ادبی ایوارڈ ۱۹۶۱ء کے نہ ملنے کے حوالے سے تجزیہ کیا کہ مصنفین نے ''علی پور کا ایلی'' کو انعام نہ دے کر شہرت پائی اور ان وجوہات کا دلچسپ بیان ہے جس کی وجہ سے مفتی کو انعام نہ دیا گیا۔ احمد بشیر کا یہ فیچر ممتاز مفتی اور لوگوں کی تصاویر پر مشتمل ہے اور اس کی سرخیاں اور احمد بشیر کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''اگر آپ کو چاند کے اندھے غاروں میں اُترنے کا شوق ہے تو علی پور کا ایلی پڑھئیے۔ ناول کے کرداروں کی طرح آدم جی ایوارڈ ۱۹۶۱ء کے ججوں نے بھی شہرت دوام پا لی ہے۔ جس طرح سودا کی وجہ سے غنچے اور غالب کے دم سے بی چاندنی نے شہرت پائی ہے۔ اس طرح آدم جی ادبی ایوارڈ ۱۹۶۱ء کے چھ ججوں کے نام پر شہرتِ دوام کے دربار میں جلا آئی یوں کہ انہوں نے ممتاز مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' کو انعام کے قابل نہیں سمجھا۔ محمد حسین آزاد زندہ ہوتے تو اپنی کتاب میں اُن کا تذکرہ ضرورت کرتے اب ہم پر یہ بوجھ آن پڑا ہے کہ ججوں کی خدمات رقم کریں اور بطور سند چھوڑ جائیں ممکن ہے کوئی اللہ کا بندہ یہ کتاب دوبارہ چھاپے اور اس میں ہماری یہ حقیقی کاوش بطور ضمیمہ شامل ہو جائے ہم نے زندگی میں خود تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اسی بہانے ہمارا بھی نام رہ جائے گا یوں بھی یہ مشاہیر ایسے قابل ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر شہرت دوام کا کوئی دربار مکمل نہیں۔''(۹)

یہ فیچر بڑا دلچسپ ہے ممتاز مفتی کی عوامی اردو کو جواز بنا کر آدم جی ادبی ایوارڈ کے منصفین نے ممتاز مفتی کے اردو میں لکھے شہرہ آفاق سوانحی ناول ''علی پور کا ایلی'' انعام نہیں دیا تھا جس پر اس وقت کے بہت سے ادیبوں کی طرح احمد بشیر بھی بے چین ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ مفتی کو ایوارڈ دے دیتے تو کوئی حیرانی نہ ہوتی اور نہ انہیں کوئی جانتا بل کہ انعام نہ دینے کی وجہ سے ہر شخص کو تجسس ہوا کہ وہ کون ہیں لوگ جن کے فیصلہ کی رو سے علی پور کے ایلی یعنی ممتاز مفتی کو انعام نہیں دیا گیا۔ ۶۹ء میں ملتان میں بولی جانے والی زبان سرائیکی نہیں بلکہ ''ملتانی پنجابی'' کہلاتی تھی۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں کے اُردو انگریزی تراجم اور مقالوں کی دلچسپ تفصیلات اس فیچر کا ماحصل ہیں اور اس دور کی یاد دلاتے ہیں۔ جب سرائیکی ابھی تک سرائیکی نہیں بل کہ پنجابی کے ایک لہجے کے طور پر جانی جاتی تھی۔ پنجابی زبان وادب کے تراجم کی اس بزم میں ماسوائے محمد ریاض انور کے کسی نے بھی اس لہجے اور پنجابی میں بات نہ کی احمد بشیر لکھتے ہیں:

> ''قاسم محمود نے اُردو میں اعلان کیا سردار عبدالجبار خان نے اُردو میں خطاب کیا۔ عدیم ہاشمی اُردو بولے۔ تصدق رسول اور اسلم انصاری انگریزی بولے۔ جیلانی کامران نے پھر اُردو کا سہارا لیا۔ ہم تو اس جلسے میں میٹھی مدھر ملتانی سننے آئے تھے کہ پنجابی کا یہ لہجہ پنجابی کا سرمایہ ناز ہے۔ اس کی گھلاوٹ کانوں میں شہد ٹپکاتی ہے۔ اس لہجے میں کسی سے نفرت نہیں کی جاسکتی مگر دل کی مسرت دل میں رہی۔ محمد ریاض انور نہ ہوتے تو چٹکی بھر سرور جو ان کی ملتانی سے پیدا ہوا وہ بھی نہ ہوتا۔''(۱۰)

پاکستانی تہذیب کی اساس اور آغاز کا سلسلہ ہمیں کئی قدیم تہذیبوں سے ملاتا ہے۔ موہنجوڈارو سے لے کر چچ برہمن تک ہڑپہ سے گندھارا تک ہماری قدیم تہذیب کے ضمن میں آتے ہیں۔ پاکستانی تہذیب اور تاریخی تسلسل اور دھرتی پوجا کی اہمیت اس فیچر میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''جو گاڑی موہنجوڈارو کا کسان چلاتا تھا۔ وہ مسلمان ہونے کے بعد بھی اس کو چلاتا رہا اور اب تک چل رہی ہے۔ اسلام نے تہذیب کا مزاج بدل دیا۔ شیروانی سکھ بھی پہنتے ہیں اور خدا کی وحدت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر عرب نہیں پہنتے۔ یہ ہند کی اسلامی تاریخ کا ورثہ ہے۔۔۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ موہنجوڈارو پاکستان کی

تہذیب کا ایک مقدس ورثہ ہے۔ تو پاکستان کی تہذیب اس سے خطرے میں نہیں پڑ جاتی۔ اس زمین میں ازل سے اب تک جو کچھ ہوا اور ہے وہ ہمارا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے اپنے ورثے کو وسیع القلبی اور معقولیت سے قبول کریں۔ ۱۹۴۷ء میں ہماری تاریخ شروع نہیں ہوئی۔ ایک نئے باب میں داخل ہوئی ہے۔'' (۱۱)

حکومتی اداروں اور اہلکاروں کی کارکردگی اس فیچر کا مرکزی خیال ہے اور ثقافتی اقدار میں شکست وریخت کا نوحہ بھی ہے۔ پاکستان پاپولر میوزک ریسرچ مشن کے زیر اہتمام یونیسکو کی طرف سے ملنے والے ثقافتی مشن پر عکسی مفتی اپنے ساتھی سمیت گاؤں گاؤں جا کر عوامی گیتوں، بولیوں اور دھنوں کو جمع کرنے نکلے تو انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا بہ قول احمد بشیر:

''عوامی کلچر کے معاملہ میں ہماری گزشتہ حکومتوں نے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ آگے کچھ ہونے کی امید ہی۔ تربیت کا نصاب تربیت کے مقرر کردہ قاصد کے پیش نظر تشکیل کیا جاتا ہے اور عوامی تہذیب وروایات کا تحفظ غالباً حکومت کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔'' (۱۲)

پاکستانیت اور ''چونڈہ'' کے محاذ کا احوال اس فیچر کی تصاویر اور سرخیوں سے بیان کیا گیا ہے۔ چونڈہ کے محاذ پر ہونے والی ٹینکوں کی لڑائی اور مقامی لوگوں کی جرأت اور شجاعت، نعرۂ تکبیر کی عظمت اور دشمن کی شعلہ بار حکمت علی اور بھرپور قوت کا جواب جیسی معلومات اس فیچر میں شامل ہیں۔ احمد بشیر لکھتے ہیں:

''چونڈہ اور بعد میں سیالکوٹ میں جو تقریریں نظمیں ہم نے سنی ان میں ایک بات مشترک پائی جاتی تمام شعراء اور مقررین جب جنگ کا ذکر کرتے ہیں پاکستانیوں کا کردار ایثار و قربانی جی داری اور تحسین کرتے ہیں مگر ساتھ ہی بھارتی سپاہیوں کی گیڈر بزدل نالائق اور جانے کیا کیا کہتے ہیں۔۔۔ بھارتی نہایت عمدہ جنگی منصوبے کے مطابق کثیر ساز وسامان اور تربیت یافتہ نفری کے ساتھ اپنی پسند کے محاذوں پر شعلہ بار ہوئے تھے دنیا کا کوئی فوجی ماہر ان کے منصوبے ہیں رخنہ نہیں نکال سکتا مگر یہ پاکستانیوں کا جگر ہے کہ انہوں نے کم ساز وسامان اور نفری

کی کمی کے باوجود ان کے دانت کھٹے کئے ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ بھارت آئندہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوگا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر وہ حملہ آور ہوا تو بڑھ چڑھ کر ہوگا اور ہمیں انہیں گیڈر اور بزدل سمجھ کر بے فکر نہیں ہو جانا چاہیے۔ پھر یہ بات پاکستانی فوج اور عوام سے ان کی خون اور پسینے کی کمائی ہوئی عظمت چھین لینے کے مترادف بھی ہے۔'' (۱۳)

احمد بشیر نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر ملنے والی فتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھارت کے فوجی بزدل نہیں تھے۔ وہ پوری تیاری سے حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ بزدل فوج نہیں تھی بل کہ ہماری فوج کے کے زندہ دل اور شیر کے جگرے والے پاک دھرتی کے بیٹوں نے بہادری سے ان کو روکا۔ اس کے ساتھ موصوف نے تنبیہ بھی کی تھی کہ بھارت کے اگر آئندہ حملہ کیا تو وہ بہت شدید ہوگا مگر افسوس کہ ہم نے اسے فیچر نگار کی نوا کے سوا کوئی اہمیت نہ دی اور چھ سال بعد ۷۱ء میں بھارت نے ہمارے ملک سے جنگ جیتی اور پاکستان کو دو ٹکڑے بھی کر دیا۔ فکرِ اقبال اور ذکرِ اقبال کے حوالے سے بھی احمد بشیر کی معلومات اور علمی بصیرت بہت نمایاں تھیں وہ اقبال کو ایک ترقی پسند اور محبت پسند اور حرکت، حرارت اور نئے افق تلاش کرنے والے پیامبر کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ سوفسطائی سوچ کے حامل اور کرائے کے مفکروں نے اقبال کو عوامی اقبال نہیں بننے دیا تھا۔ اس فیچر میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

'' اقبال دنیا میں جاگیرداری اجارہ داری کی حفاظت کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس کا فکر مسلمانوں کی مجلسی زندگی کے مطالعے کا نتیجہ تھا جس کی بنیاد دین حق ہے اور دین ہر ایک کے لیے نجات کا راستہ اور منزل ہے۔ اس کی تشریح میں اقبال کے کلام کو چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کو اقبال کے قریب آنے دیجئے کیونکہ عوام کے بہت قریب تھا اور یہی مطالعہ اقبال کا صحیح زاویہ ہے۔''(۱۴)

اس زاویہ سے اقبال شناسی کے چلن کو عام کرنے سے ہی اقبال کو وہ اقبال ملے گا جو عوامی سطح پر ہر قسم کے کس بل نکال دے گا اور عالم امکاں بشریت کی زد میں ہوگا اور کن فیکون کی صدائیں بلند ہوں گی اور زندگی نئی کروٹیں لے گی اس فیچر میں یہی رنگ چھایا اور سمایا ہوا ہے۔ روزنامہ امروز نے فیچر نگاری کی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس کردار میں احمد بشیر کا بھی حصہ تھا اور اسے ہر معتبر صحافی نے تسلیم کیا ہے اور ''امروز'' اس دور میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا اس

دور میں احمد بشیر کے علاوہ اے حمید، حمید اختر اور دیگر لوگ بھی امروز سے وابستہ تھے۔ نمایاں فیچر نگار جو اُن دنوں ''امروز'' میں فیچر نگاری کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں سماجی معاشرتی اور سائنسی فیچر لکھ رہے تھے۔ ان میں کئی اہم نام شامل تھے اور ہر مصنف کی فہرست میں اس دور کے حوالے سے احمد بشیر کا نام ضرور شامل ہے۔ محمد اسلم ڈوگر اس دور کے فیچر کی اقسام اور اہم نام یوں لکھتے ہیں:

> ''امروز'' میں سماجی، معاشرتی، تاریخی اور سائنسی فیچر شائع ہوتے تھے۔ اس کے ابتدائی فیچر نگاروں میں عبداللہ ملک، احمد بشیر، نصیر انور، حسن عابدی، انتظار حسین اور عبدالقادر حسن کے نام شامل ہیں۔''(۱۵)

ان دنوں نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ ملک میں ہر طرف مہاجرین کی بے بسی، مظلومیت اور ان کی آباد کاری کے مسائل کا چرچا تھا۔ اخبارات نے اس صورتحال میں ان لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کا کام انجام دیا۔ خبروں، کالموں اور اداریوں میں وہ حکومت کی رہنمائی کرتے رہے اور معاشرتی، سماجی اور سائنسی فیچر نگاری کے سلسلے کو بھی اخبارات خصوصاً اور اخبارات کے ایک مشن سمجھ کر چلایا۔ اس سے عوامی شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر استحکام کو بھی فروغ ملا۔ ملکی ترقی کے فروغ کے اس صحافی کارواں میں احمد بشیر کا نام بھی شامل ہے۔ بل کہ انہیں اولیت بھی حاصل ہے۔ اس حوالے سے اکمل علیمی لکھتے ہیں:

> "He was one of the poineer of Modern Urdu Journlism."(16)

فیچر نگاری کے آغاز کے حوالے سے دیگر احباب کے علاوہ زاہد عکاسی بھی ان کے قیام پاکستان کے بعد اور فیچر نگاری کے بانی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''احمد بشیر جو کہ پاکستان میں فیچر رائیٹنگ کے موجد ہیں۔ انہوں نے صحافت کا آغاز امروز سے کیا تھا۔ ان دنوں اس کے ایڈیٹر بلند پایہ نثر نگار و عالم مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔''(۱۷)

''ہیرا منڈی'' کے عنوان سے لکھے گئے فیچر اور ''اس بازار'' کی تحقیق کی بدولت شورش کاشمیری کی وجود میں آنے والی کتاب سے متعلق بیگم محمودہ احمد بشیر لکھتی ہیں:

''اس بازار میں نامی کتاب کی ریسرچ احمد بشیر نے کی تھی مگر شورش کاشمیری نے ۴۰ روپے دے کر کتاب اپنے نام سے چھاپ دی۔ یہ حقیقت ہے صرف میں جانتی ہوں۔''(۱۸)

روزنامہ ''امروز'' میں اختلاف ہوا تو پھر احمد بشیر نے ''نوائے وقت''، ''زمیندار''، اور '' احسان'' میں بھی نوکری کی اور یہاں بھی ایک کے بعد ایک اختلاف کا سلسلہ جاری رہا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک کراچی ریڈیو سے سکرپٹ رائٹر کی نوکری نہ مل گئی۔ اس دور کے متعلق بیگم محمودہ احمد بشیر لکھتی ہیں:

''لاہور میں پے در پے نوکریاں چھوٹتی رہیں۔ ایک بار عید کا دن تھا۔ ہمارے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ مرزا ادیب ہمارے گھر ملنے آئے تو اپنے آلو جو کہ وہ بازار سے لائے تھے لے جانا بھول گئے۔ ہم نے وہ پکا کر عید گزاری۔ امروز، احسان، زمیندار، نوائے وقت سب اخباروں سے کسی نہ کسی اختلاف کی وجہ سے نوکریاں چھوٹتی رہیں۔''(۱۹)

اس کے علاوہ احمد بشیر کی فیچر نگاری کا نمایاں اور آخری دور روزنامہ ''مساوات'' کے اجراء سے شروع ہوا۔ اس میں احمد بشیر براہ راست تین اہم شعبوں سے وابستہ رہے وہ مساوات کا اداریہ بھی لکھتے تھے۔ کالم نگاری اور فیچر نگاری بھی کرتے تھے۔ اس دور کے مساوات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے وہ صحیح معنوں میں صحافتی اقدار کی پاسداری کے امین تھے۔

اس دور کی فیچر نگاری بھی ان کی شخصیت اور صحافتی اقدار کی اہمیت کی پاسداری کی حامل ہے انہوں نے افریشیا کے عنوان سے ہفتہ وار فیچر نگاری شروع کی۔ اس ایڈیشن میں ایشیاء اور افریقہ کے مسائل ان ممالک کی سیاسی اور نظریاتی جدوجہد اور عالمی سطح پر اس کے اثرات سے ہونے والے تغیر و بتدل کا جائزہ لیا جاتا اور ان تصویروں کے ذریعے واقعات اور حقیقت بیانی کو عام قاری تک ابلاغ کا ذریعہ بنایا جاتا۔ اس دور کی فیچر نگاری کی سرخیوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں علمی، سیاسی، اور عالمی حالات و واقعات کا کتنا ادراک تھا۔ افریشیا کے عنوان سے ''مساوات'' میں انہوں نے فیچر نگاری کی۔ اس میں انہوں نے لاطینی امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا کے حوالے سے کئی اہم فیچر لکھے خصوصاً براعظم افریقہ کے کئی ممالک یورپی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہے ہیں۔ ہر ذی شعور اور آزادی منش انسان نے ان کی خود مختاری اور

آزادی کی حمایت کی ہے۔ فیض سے لے کر احمد بشیر تک یہ سلسلہ جاری رہااور آج بھی جاری ہے۔ براعظم افریقہ کے حوالے سے احمد بشیر کے ایک فیچر کی نمایاں سرخیاں:

''(۱)افریقہ جاگ رہاہے

(۲) گوری حکومت نامبیا کے عوام سے حیوانوں سا سلوک کرتی ہے۔

(۳)سامراجی طاقتیں نامبیا میں مجلس اقوام متحدہ کے فیصلوں میں نفاذ نہیں چاہتیں۔

(۴) سامراجیوں کا مظلوم اقوام متحدہ کے خلاف متحدہ محاذ۔''(۲۰)

آسٹریلیا کی قدیم تہذیب وثقافت یورپی سامراج کے تسلط اور لوٹ مار اور موجودہ دور میں اس کے لیے کردار اور خود مختار آسٹریلیا کے عزایم اور عالمی سیاست میں اس کی اہمیت اور آسٹریلیا میں یورپی اقدامات اور لوٹ مار کے حوالے سے فیچر کی سرخیاں ہیں:

''(۱)آسٹریلیا کو لوٹنے کا آغاز کیپٹن کک نے کیا۔

(۲) یورپی تہذیب سامراجی سرمایہ داروں کے غلبہ کا نام ہے۔

(۳)وھائٹم نے عالمی سیاست میں آسٹریلیا کا نیا کردار واضح کیا ہے۔

(۴)آسٹریلیا کی نئی حکومت آزاد اور موثر کردار کی خواہاں ہے۔

(۵) آسٹریلیا کے اصل باشندے ۱۹۶۹ء میں بھی پتھر کے زمانے کی زندگی گزارتے تھے۔''(۲۱)

روسی زار پال خلافت اسلامیہ کے زمانے سے ہی یہ خواب دیکھتے رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ترکی کے ساحلی علاقوں پر قبضہ جمایا جاسکے اور قیام پاکستان کے بعد روسی حکومتوں کی یہ کوشش رہی کہ وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کو دباؤ میں لاکر پاکستانی ساحلوں کو اپنے تسلط میں لائیں۔ اس کے لیے روس نے ہمیشہ افغانستان کا اڈا استعمال کیا۔ روسی زار پال کے ادھورے خوابوں کے حوالے سے ان کے فیچر کی سرخیاں ہیں:

''(۱) کیا پختونستان کا نعرہ زار پال کا ادھورا خواب ہے؟

(۲) ایشیائی تحفظ تنظیم چھوٹی قوتوں پر بھارت کے غلبہ کا منصوبہ

(۳) روسی زار قسطنطنیہ پر قبضے کی آرزو میں مر گئے

(۴) پاکستان بھارت کا محافظ ہے دست نگر نہیں۔"(۲۲)

پاکستان اور لیبیا کی دوستی بھٹو کے زمانے میں پروان چڑھی جب اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس دور میں شاہ فیصل مرحوم اور کرنل قذافی مرحوم دو اہم مسلم سربراہان بن کر ابھرے۔ کرنل قذافی نے پاکستان سے بھرپور دوستی نبھائی۔ انہوں نے لاہور کے نیشنل اسٹیڈیم میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ پاکستانی قوم سے بھرپور عوامی خطاب کیا۔ اس یادگار موقع پر اس اسٹیڈیم کا نام بھی ان کے نام پر قذافی اسٹیڈیم رکھ دیا گیا۔ کرنل قذافی امریکی دشمنی اور افریقہ دوستی میں پیش پیش رہے اور فلسطینی عوام کے مددگار کے طور پر بھی ان کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ لیبیا اور پاکستان دوستی کے بارے میں فیچر کی جھلکیاں ہیں:

"(۱) فلسطینی مجاہدوں کا مددگار پاکستان کا عظیم دوست لیبیا

(۲) کرنل قذافی نے مغربی سامراج کے ایوانوں میں کھلبلی مچادی۔

(۳) مرحوم صدر ناصر نے عربوں کو زندگی کا ایک نیا جذبہ دیا۔

(۴) افسر شاہی نے لیبیا کی ترقی کو روک رکھا ہے۔"(۲۳)

ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ بھارت کے باپو نے تو اسے تسلیم کر لیا اور معاہدے کی پاسداری کے لیے مرن بھرت (بھوک ہڑتال) بھی رکھا۔ نہرو اور ان کے تنگ نظر گماشتوں نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ بھارت کی زیادہ تر حکومتیں پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں۔ بھارت پہلے روس کی پشت پناہی کے بل پر اور آج کل امریکہ بہادر کی اشیر باد سے خطے کا چودھری بننے میں جتا ہوا ہے۔ اردگرد کے کمزور ممالک کو اپنی دھونس سے اپنا ہم نوا بنانے پر تلا ہوا ہے۔ تجارتی طور پر ان ممالک کی منڈیوں پر اپنا غلبہ اور قبضہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ بس پاکستان اور چین ایسی کوشش کو ناکام بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور کبھی کبھی سری لنکا جیسے ممالک بھی پاکستان کی ہم نوائی کرتے ہیں۔ سری لنکا کے حوالے سے فیچر کی سرخیاں ہیں:

"(۱) سری لنکا کی آواز آزاد ایشیاء کی آواز

(۲) بھارت کی توسیع پسندی کا رنگ کھل رہا ہے۔

(۳) بھارتی حکمران امریکا اور برطانیہ سے رومان لڑا رہے ہیں۔

(۴) نئی سیتا لنکا رام کرنے کے لیے آج کل لنکا میں ہے۔

(۵) بھارتی صنعت کار مہنگا اور بیکار مال فروخت کر کے سری لنکا کے عوام کو لوٹ رہے ہیں۔" (۲۴)

الغرض احمد بشیر نے اُردو فیچر نگاری میں اولیت کے ساتھ ساتھ اپنی اہلیت سے اسے قیام پاکستان کے بعد کی صحافت کی اہم صنف بنانے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ جو ان کی صحافت سے اور صحافتی اقدار سے سچی وابستگی کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری لکھتے ہیں:

"مستقل مزاجی، لگن، مقصد کی سچائی میں یقین کامل اور کام کی دھن اور مہم جوئی ایک فیچر نگار کے بنیادی اوصاف ہیں۔" (۲۵)

احمد بشیر صحافتی اقدار کی حامل ان کسوٹیوں پر پوری طرح پورا اُترتے ہیں۔ فیچر نگاری کے اسرار و رموز سے وہ بخوبی آگاہ تھے اور یہ صحافتی آگاہی ان کی پہچان بنی انہوں نے جو لکھا، جب لکھا بلا خوف و خطر لکھا اور پاکستان میں فیچر نگاری کے بانیوں میں نہیں بلکہ بانی قرار پائے اور ان کے فیچر معلومات کا خزانہ ہوتے تھے۔ تجسس، دلچسپی اور سچائی ان کی تحریروں میں بڑی نمایاں ہوتی۔

حوالہ جات

۱۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، دیباچہ، مشمولہ فیچر نگاری، شفیق جالندھری، لاہور: علمی کتب خانہ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲

۲۔ وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا، تعارفی، صفحہ احمد بشیر ۱۲ اگست ۲۰۱۶ء

۳۔ احمد بشیر، انٹرویو، مشمولہ، فیملی میگزین، لاہور، ۱۲ جون ۲۰۰۴ء

۴۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، ص ۳۳۲

۵۔ احمد بشیر، شہر سرائے، فیچر مشمولہ، روزنامہ امروز، لاہور، یکم ستمبر ۱۹۶۹ء

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً، ۲۷ جولائی ۱۹۶۹ء

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً، ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء

۱۰۔ ایضاً، ۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

۱۱۔ ایضاً، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

۱۲۔ ایضاً، ۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

۱۳۔ ایضاً، ۲۴ اپریل ۱۹۶۹ء

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۳۲

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ اکمل علیمی، Ahmed Bashir's Way Ward Hear، مضمون، مشمولہ، ہفت روزہ، فرائیڈے ٹائمز، لاہور، ۲۱ تا ۲۷ مارچ، ۲۰۰۸ء

۱۷۔ زاہد عکاسی، کالم مشمولہ، روزنامہ دن، لاہور، ۱۱ دسمبر ۲۰۰۴ء

۱۸۔ محمود احمد بشیر، دو تحریریں، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳

۱۹۔ محمودہ احمد بشیر، ایضاً، ص ۱۶

۲۰۔ ایضاً، ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء

۲۱۔ ایضاً، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۳ء

۲۲۔ ایضاً، ۲۳ دسمبر، ۱۹۷۲ء

۲۳۔ ایضاً، ۱۲ فروری ۱۹۷۳ء

۲۴۔ ایضاً، ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء

۲۵۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، ص ۱۱۲